گلشنِ رازِ جدید

از

مہ محمد اقبال

ترجمہ

شریف کنجاہی

گلشنِ رازِ جدید

بزبانِ

از

علامہ محمد اقبال

ترجمہ

شریف کنجاہی

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
ناظم
اقبال اکادمی پاکستان
چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

طبع اول ۱۹۹۶ء
تعداد ۵۰۰
قیمت : ۴۰/- روپے

مطبع : پاکستان پرنٹنگ ورکس، لاہور

محل فروخت : ۱۱۶ - میکلوڈ روڈ، لاہور فون : ۷۳۵۷۲۱۴

علامہ اقبال کی فارسی مثنوی

گلشن راز جدید

(منظوم اردو ترجمہ)

مترجم :- شریف کنجاہی

تری آنکھوں کی پتلی کے لئے پیدا نظر کی ہے
عطا میں نے تری سوچوں کو دنیائے دگر کی ہے
ہے محو خواب خاور اور نہاں تاروں کی آنکھوں سے
سرود زندگی گاتے ہوئے پیدا سحر کی ہے

''گفتنی ہا''

(شریف کنجاہی)

شیخ محمود شبستری کی مثنوی گلشن راز عرفانی ادب میں ''بقامت کہتر'' اور ''بہ قیمت بہتر'' کے مقام کی حامل ہے اور مصنف کی دوسری تصانیف سے زیادہ معروف و مقبول۔ برصغیر میں اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا جب علامہ اقبال نے اس سے متاثر ہوکر گلشن راز جدید کے نام سے ایک مختصر سی مثنوی لکھی۔ اول الذکر مثنوی میں سوالات کی تعداد ثانی الذکر سے زیادہ ہے۔ اس کمی بیشی کا سبب دونوں کا بعد مزاج ہی ہوسکتا ہے اور بعد زمان بھی۔ نظرانداز کئے گئے سوالات وہی ہیں جن پر اظہار خیال کرنا شاید اقبال کے مزاج کے مطابق نہیں تھا اور عمرانی اور معاشرتی تبدیلی کے باعث وہ استعارات و اشارات بے تاثیر بلکہ غیر مفید ہوچکے تھے۔ دونوں کے مزاج کا اختلاف مشترک سوالات کے جوابات میں بھی جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے اپنے اپنے عصری تقاضے تھے۔ اور فکری ماحول سے متاثر ہونے کا اپنا اپنا انداز جس میں اول الذکر زیادہ ثابت قدم رہے کہ اقبال بعد میں وحدت الوجود کے اعتزالی بن گئے تھے۔ پھر بھی وہ اس مثنوی کے اثرات تلے عمر بھر رہے۔

گیارہ مشترک سوالات جن کو گلشن راز جدید میں سمیٹ کر نو بنادیا گیا تھا وہی سوال ہیں جن سے ہر دور میں ارباب فکر و معنی کو واسطہ پڑتا رہا ہے۔ اور ان کا لاینحل ہونا اسی سے عیاں ہے کہ اقبال کو بھی عقدہ کشائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور نہ جانے کتنے اور لوگ کب تک اس میں مصروف رہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اخذ نتائج کے اسلوب میں تبدیلی آگئی ہے۔ اور جہاں محمود سے تا بہ اقبال گرہ کھولنے میں تفکر سے زیادہ کام لیا جاتا تھا وہاں

گذشتہ نصف صدی سے حقیقت کائنات کو سمجھنے اور جاننے میں فزکس، بائیو کیمسٹری اور بائیولوجی وغیرہ سے بھی مدد لی جانے لگی ہے۔ اور تعجب انگیز یہ ہے کہ ان کی دریافتیں کافی حد تک کائنات کی غیر مادی تعبیر کا وہی رجحان لئے ہوئے ہیں جو صوفیائے مشرق سے مخصوص رہا ہے اور گلشن راز میں جس کی جھلک ملتی ہے۔ چنانچہ جہاں حیات شناس (جن کو اقبال نے موجودات کی غیر مادی بنیاد ثابت کرنے میں اپنے انگریزی لیکچروں کے اندر بطور گواہ پیش کیا) مادیت کی طرف لوٹ جاتے نظر آنے لگے تھے وہاں فزکس کے کنج کاو تجربے کی صداقت سے مجبور ہوکر میکانیکی تکوین حیات کے حصار سے نکل کر اس نظریے کی فضا میں آگئے کہ تمام طبعی ہونیوں میں ذہنی کار فرمائیوں کا سراغ ملتا ہے۔ اس فکری رویے کو مقداری میکانیات نے مزید سہارا دیا جس سے مادہ شناسوں کی دلچسپیاں سائنس کی فلاسفی میں اور اساس شناسی میں پیدا ہونے لگیں۔ چنانچہ ہیزن برگ ایسی جدید طبیعیات کی نامور شخصیت نے "مقداری طبیعیات کے فلسفیانہ مسائل" میں اس پر زور دیا کہ طبیعی قوانین کا تعلق ذرات ابتدائی سے کہیں زیادہ ان ذرات کے بارے میں ہمارے علم سے ہے۔ یعنی ہمارے ذہنوں کے مافیہ سے۔ اس طرح مقداری میکانیات میں بنیادی مساوات کا تصور پیش کرنے والے ارون شروڈنگر نے اپنے مجموعہ مقالات "ذہن اور مادہ" (Mind and Matter) میں جن خیالات کا اظہار ربع صدی پہلے کیا تھا وہ سائنسی سے زیادہ عرفانی نظریہ کائنات کی طرف جاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت یوجین و یگنر کی ہے جو نوبل انعام یافتہ ہے۔ جسم و ذہن کے تعلق کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے و یگنر نے کہا ہے کہ اب بہت سے طبیعیات شناس اس کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ موجودات میں خیال ہی کو مادے پر اولیت حاصل ہے۔ اس کے خیال میں مقداری میکانیات کے قوانین کی تشکیل شعور کے حوالے کے بغیر قابل اعتماد طریقے سے ممکن ہی نہیں۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کائنات کا سائنسی بنیادوں پر مطالعہ ہی شعوری مافیہ کو حقیقت اولیٰ (Ultimate Reality) تسلیم کروا گیا ہے۔

دوسری جانب ایلڈوئس ہکسلے ایسے اہل فکر بھی معرفت اور عرفان اور جدید انداز سے تجزیہ کرکے اس مسلک کو محسوس کے خوگر جدید ذہن کے قریب لے آئے ہیں۔ اپنی ایک مختصر سی لیکن بہت وقیع کتاب "ادراک کے کواڑ" (The Doors of perception) میں وہ رقم طراز ہے کہ مجھے ڈاکٹر سی ڈی براڈ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ برگساں کی یادداشت اور ادراک حسی کے بارے میں کہی گئی باتوں پر زیادہ سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ دماغ، نظام عصبی اور اعضائے حسی کا عمل تخلیقی (Productive) نہیں انتخابی (Eliminative) ہے۔ ہر آدمی ہر لمحے اس قابل ہوتا ہے کہ ہر بیتی گزری کو یاد رکھ سکے اور کائنات میں ہر کہیں جو کچھ رونما ہورہا ہے اسے مشاہدہ کرسکے۔ لیکن دماغ اور نظام عصبی کا کام یہ ہے کہ وہ بے مقصد اور بے محل آگاہی کی یورشوں کی گراں باری سے ہمیں بچاتے رہیں۔ اور وہ اسی طرح ممکن ہے کہ فی الوقت جس آگاہی کی ہمیں ضرورت ہو صرف اسی کو ہم تک پہنچنے دیں۔ اس اجمالی آگاہی کے مافیہ اور ماہیت کو ترتیب دینے اور اس کا اظہار کرنے کے لئے انسان کو جوہر تکلم ملا ہے جسے وہ مسلسل سنوارتا نکھارتا چلا جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی اس جوہر تکلم یعنی زبان کا مستفاد بھی ہے اور اس لسانی روایت کا غلام بھی جس میں وہ آنکھ کھولتا ہے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف زبان کے ذریعے اس کی رسائی علمی اندوختے تک ہوجاتی ہے وہاں زبان معلومات کے اظہار و قبول کے ایک وسیلے کے طور پر اس کے اس اعتقاد کو بھی پختہ کرجاتی ہے کہ یہ اجمالی آگاہی (Reduced Awakeness) ہی آگاہی کی واحد صورت ہے۔ یہ اعتقاد اس کے ادراک حقیقت میں اختلال پیدا کردیتا ہے اور وہ اپنے مدرکات کو حاصلات (Dater) اور الفاظ کو اشیا سمجھنے اور جاننے لگتا ہے۔ اور مذہب نے جسے "یہ جہاں" کہا ہے وہ اصل میں "اجمالی آگاہی" ہے جسے زبان نے الفاظ کے روپ میں جامد کرکے رکھ دیا ہے۔ جبکہ کتنی ہی اور دنیائیں ہیں جو ذہن بے زنجیر (Large at Mind) کی آگاہی کامل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ ہم میں سے بیشتر بیشتر اوقات اسی کو جانتے ہیں جو ہم تک مختصر سازی کے بعد پہنچتا ہے اور جسے ہماری زبان صداقت مقدسہ

کی مسند پر بٹھا دیتی ہے۔ لیکن بعض لوگ اس مختصر ساز آلے کو "بائی پاس" کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کے باعث ان کی آگاہی میں حقیقت مطلق کے بعض وہ پہلو آجاتے ہیں جن سے "لکیر کے فقیر" محروم ہوتے ہیں۔

بکسلے نے جس بائی پاس کر جانے کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے میرے خیال میں وہی راہ مراد ہے جسے علم کے مقابلے میں عرفان کی اور عقل کے مقابلہ میں دل کی راہ کہا جاتا ہے۔ گلشن راز (جدید و قدیم) کے مصنف اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اوور اقبال شبستری سے بعض باتوں میں متاثر تھے۔ یہ احساس مجھے موخرالذکر کے اشعار سے ہوا جس کی مہک فکر و کلام اقبال میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ مثلاً" اپنے انگریزی لیکچروں میں علامہ نے تفصیل کے ساتھ زمان و مکاں کی چگونگی کے متعلق بحث کی ہے اور متعدد اشعار میں بھی اس موضوع کو چھیڑا ہے۔ چنانچہ اگر شبستری کہتے ہیں کہ :

؎ ہم جمع آمدہ چوں نقطہ حال
ہمہ دور زماں ' روز ومہ و سال

جاوید نامے کی ابتدائی مناجات میں اقبال کہتے ہیں :

؎ اے خوش آں روزے کہ از ایام نیست
صبح اورا نیم روز و شام نیست

اسی مناجات کا ایک مصرع ہے : نوبت او لایزال و بے مرور ------ جبکہ شبستری نے اسی بات کو یوں پیش کیا ہے : ازل عین ابد افتادہ باہم
گلشن راز کے کچھ اور شعر ملاحظہ ہوں

؎ توئی تو نسخہ نقش الٰہی
بجو از خویش ہر چیزی کہ خواہی

ندا می آید از حق بر دوامت
چرا گشتی تو موقوف قیامت

گدای گردد ازیک جذبہ شاہی
بیک لحظہ دہد کوہی بکاہی

اس آخری شعر کے ساتھ اقبال کے اس شعر کو ذہن میں لائیے :

سطوت از کوہ ستانند و بکاہے بخشند
کلہ جم بگدائے سر راہے بخشند

لیکن ایک بنیادی مسئلے میں دونوں کی رائے قطعیت کے ساتھ ایک دوسرے سے مختلف ہے اور وہ ہے مسئلہ جبر و قدر، شبستری نے بھی حدیث نبویؐ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ

ہر آں کس را کہ مذہب غیر جبر است
نبی فرمود او مانند گبر است

دوسری طرف اقبال کہتے ہیں

حدیث خواجہ و سلطان بدر است
کہ ایماں درمیان جبر و قدر است

بہت سے عرفانیوں کی طرح فکر و احساس کا ایک منفرد و مخصوص رجحان اقبال میں بھی ملتا ہے۔ اور شعر کہتے ہوئے بھی اپنے شاعر سمجھے جانے کے بارے میں ان کے اندر جو الرجی پائی جاتی تھی میرے خیال میں اس کا باعث بھی یہی تھا کہ وہ ایک عارف کے طور پر معروف ہونا چاہتے تھے اور ان کی باطنی واردات کی بنا پر جن کا ان کے اشعار و افکار سے پتہ چلتا ہے ان کو حکیم و فلسفی کی جگہ عرفانی کہنا ہی زیادہ موزوں تھا۔ لیکن وہ ایک ایسے دور میں آئے

جب کائنات کا مادی تصور انگریزی لیکچروں کے دیباچے میں لگائے گئے ان کے اپنے اندازے کے علی الرغم پسپا نہیں ہوا تھا اور لوگوں نے ان کو عارف کی جگہ حکیم امت اور متکلم ہی سمجھا۔ شاید اس لئے کہ عارف کے ساتھ جو کچھ عام طور پر منسوب کیا جاتا تھا اقبال کی زندگی بظاہر اس سے مختلف تھی۔ پھر ان کا درس بھی وہ درس نہیں تھا جو شبستری سمیت صوفیاء و عرفا بیشتر دیتے چلے آئے تھے۔ اور وحدت الوجود کے رویے کی جس طرح اور جس سطح پر انہوں نے نفی کی اس نے بھی اس حلقے میں ان کی جگہ مخدوش کردی۔ اس کے باوجود وہ اپنے باطنی میلان کے باعث اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو ہارڈنگ کی طرح سر نہ رکھنے والوں کا قبیلہ تھا۔ اور جہاں اس شعر میں انہوں نے ادھر اشارہ کیا ہے کہ

؎ بیابہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

وہاں گلشن راز جدید میں آٹھویں سوال کے جواب کا دوسرا بند سارے کا سارا اسی کی وضاحت ہے کہ

؎ نگہ را در حریمش نیست راہے
کنی خود را تماشا بے نگاہے

بلکہ پانچویں سوال کا جواب دیتے ہوئے بھی "تماشا بے شعاع آفتابے" میں اسی رجحان کا اظہار ہے۔ اور سوچا جائے تو "اندر خود سفر کن" یہی کچھ ہے کہ ان آنکھوں کی گدائی نہ کی جائے۔ جو سر کا حصہ ہیں گو دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بے سر کی آنکھ سے دیکھنے والے دو اکابر اتفاق کی جگہ اختلاف کرتے اور اس پر اصرار کرتے ہوئے ملیں جس طرح وحدت الوجود کے معاملے میں چلا آیا ہے یا جبر و اختیار کے معاملے میں۔

اقبال نے جس طرح جاوید نامے کے شروع میں لکھا ہے کہ "ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بود است" اسی طرح اس مختصر سی مثنوی میں بھی جو خلائی تسخیر سے بہت پہلے لکھی گئی

تھی قمرو پرویں میں اپنا گھر بنانے کی بات کی ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ یہ سوچ اور یہ خواہش ان کے اندر ہمیشہ موجود رہی کہ انسان ستاروں پر کمند ڈالے۔ اور اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ ادھر شبستری نے بھی سورہ الطلاق (آیت ۱۲) کے حوالے سے "**مثلھن**" کی حضرت ابن عباس والی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہو سکتا ہے گلشن راز ہی سے اقبال کو حضرت ابن عباس والی بات کو اور آگے بڑھانے کا اور اس میں نیا مفہوم پیدا کرنے کا خیال آیا ہو جس طرح واقعہ معراج کی تفسیر و تفہیم کے سلسلے میں انہوں کیا۔

گلشن راز جدید کی تصنیف کا دور عالمی سیاست کے حوالے سے وہی دور تھا جس میں "ترک ناداں" خلافت کی قباچاک کرنے پر موضوع سخن بنا ہوا تھا۔ چنانچہ اس مثنوی میں بھی ترکوں کے تجدد پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا اور جاوید نامہ میں بھی۔ اسی طرح جمہوریت کو جہاں انہوں نے بندوں کو تولنے کی جگہ گننے والی طرز حکومت کہا وہاں اس مثنوی میں ساتویں سوال کا جواب دیتے ہوئے جب وہ کسی مرد کامل کی بات کرتے ہیں تو فقیہہ و شیخ و ملا کی بیعت سے منع کرتے ہوئے آئین جمہوری کو بھی افرنگ کی عطا بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کو رواج دے کر گویا دیو کی گردن سے رسی کھول دی گئی ہے۔ وہ اسے تیغ بے نیام کہتے ہیں۔ جمہوریت کی مذمت میں ان کا یہ شعر تو بہت مشہور ہے کہ

؎ گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

لیکن کسی پختہ کار یا مرد کامل کی ضرورت اور اہمیت پر اولاً اسی مثنوی میں زور دیا گیا اور خوب کھل کر۔ ورنہ کبھی ان کے نزدیک جمہوریت ہی ملت اسلامیہ کے لئے بہترین طرز حکومت تھی بلکہ برطانوی جمہوریت ان لوگوں کے لئے جو شخصی حکومتوں کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے' ایک نعم البدل تھی۔ اور حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں انہوں نے ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو اس کی جگہ اجماع کی اصطلاح سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ "میرے نزدیک اجماع اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے اہم ہے اور انہوں نے اس پر اظہار تعجب کیا

تھا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ادارے کی شکل اختیار نہ کرسکا۔ ان کو یہ دیکھ کر اطمینان بھی ہونے لگا تھا کہ اس وقت دنیا میں جو نئی قوتیں ابھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن میں اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے امکانات مستور کا شعور پیدا ہونے لگا ہے اور بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کی نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی پسندانہ قدم ہے۔

ادھر زبور عجم (گلشن راز جدید سمیت) ۱۹۲۳ء میں شائع ہوچکی تھی اور بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی سال کے عرصہ میں آپ نے دو مختلف باتیں کیسی کہہ دیں۔ یہ ضرور ہے کہ "جمہوری قبا میں دیو استبداد" کی بات انہوں نے بتکرار کہی ہے بلکہ اپنے والد کے نام ایک خط میں بھی اس کا اظہار کیا جاچکا تھا کہ "بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دنیا کی نجات نظر نہیں آتی" تو دونوں میں سے ترجیح اس کو دینی پڑتی ہے جس کا اظہار غالباً ۱۹۱۵ء میں یہ کہہ کر کیا گیا تھا

؎ اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدہ امکاں بیا

جب وہ عالمگیر جنگ کا ہنگامہ دیکھ رہے تھے اور افرنگی جمہوریت کے نتائج بھی۔ تین جون ۱۹۲۰ء کو لکھے گئے مذکورہ بالا خط میں گویا اسی کا اعادہ کیا گیا تھا اور گلشن راز جدید میں بھی اسی کو دہرایا گیا۔ ادھر "اجماعیت" کی بات انہوں نے دوبارہ بالاصرار نہیں کی کہ تجربے اور وقت نے جمہوریت سے ان کو بد دل سا کردیا تھا۔ اور ارمغان حجاز میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے عنوان سے ان کا ابلیس ہی کی زبان سے یہ کہلوانا کہ

؎ ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

اشارہ کرتا ہے کہ وہ عمر کے آخری ایام میں طرز جمہوری سے گریزاں گریزاں تھے۔ اور اسے جمہوری تماشا جانتے ہوئے کسی روحانی جمہوریت میں اس کا متبادل ڈھونڈنے لگے تھے جس کی

طرف انہوں نے چھٹے لیکچر کے اختتام پر اور مختلف اشعار میں بھی اشارہ تو کیا لیکن شاید خرابی صحت کے باعث وہ کوئی واضح تصور پیش نہ کرسکے۔ اس سے ان کی کیا مراد تھی میں اس موضوع کو زیادہ موزوں حضرات کے لئے چھوڑتے ہوئے اس مثنوی کے اردو روپ کی اشاعت کا سامان پیدا کرنے پر پاکستان اقبال اکیڈمی کا شکریہ ادا کرتا ہوا اپنی بات کو ختم کرتا ہوں جو آج سے تقریباً گیارہ برس پہلے کیا گیا تھا۔ لیکن ------ پس از مدت گذار افتاد برما کاروانے را۔

شریف کنجاہی

۱-۱-۹۵

تمہید

گئی مشرق کی روح سے سوز ناکی
بدن سے جاں گئی بس دم ہیں باقی

کوئی تصویر سی ہے جی رہی ہے
خبر اس کو نہیں کیا زندگی ہے

نہ اس کے دل میں کوئی مدعا ہے
اب اس کی بانسری ہی بے صدا ہے

نئے انداز میں آیا لبوں پر
جواب نامہ شیخ شبستر

کسی نے بھی تو بعد اس کے شرارا
ہمارے خرمن جاں میں نہ پھونکا

کفن پہنا ہے گو ہم نے قبولی
پہ دیکھا عرصہ محشر نہ کوئی

ادھر تبریز کا وہ مرد دانا
ستم چنگیزیوں کے تک چکا تھا

نئی بدلاہٹ اک دیکھی ہے میں نے
نئے سورج کو دیکھا ہے ابھرتے

رخ معنی سے گھونگھٹ کو اٹھایا
کف ذرہ پہ سورج کو بٹھایا

نہ وہ ہوں بن پیئے ہی لڑکھڑاؤں
نہ وہ شاعر کہ بے پر کی اڑاؤں

توقع خیر کی اس پست سے کیا
مجھے الزام دے جو شاعری کا

نہ کام ہے کچھ سوئے دلدار میرا
غم یاری نہ ہے دل زار میرا

نہ ہوں مٹی کسی کی رہگذر کی
نہ تن میں دل کی فطرت بے نہاری

میں جبریل امیں سے ہم زباں ہوں
رقیب و قاصد و درباں نہ جانوں

فقیری میں کلیمی ٹھاٹھ میرے
فر شاہی مری گدڑی سے نیچے

وہ مٹی ہوں نہ صحرا میں سماؤں
وہ پانی ہوں نہ دریا میں سماؤں

مرے شیشے سے دل پتھر کا تھر تھر
ہے بے ساحل مری سوچوں کا ساگر

مرے نغموں میں تقدیریں چھپی ہیں
کہ حشریں میری گودی میں پلی ہیں

میں اپنے آپ میں پل بھر جو ڈوبوں
اٹھے اک جہاں کو لے کے ابھروں

نہیں عار ایسی مجھ کو شاعری سے
"کہ سو صدیوں میں اک عطار آئے"

مری جاں جینے مرنے کا اکھاڑا
حیات جاوداں مقصود میرا

تری مٹی کو خالی جاں سے پایا
تو اپنی جاں سے تن تیرا بسایا

میں اپنی آگ سے ہوں مثل گلخن
بنا لے اس سے اپنی رات روشن

مری مٹی میں دل بویا گیا ہے
انوکھا خط مری لوح پر لکھا ہے

خودی کی چاٹ مجھ کو شہد جیسی
یہی کچھ ہے کہوں کیا آپ بیتی

پیا پہلے یہ خود میں نے پیالا
پھر اہل شوق کے لب سے لگایا

اگر جبریل یہ تحریر دیکھے
سمجھ کر گرد نور اپنا جھٹک دے

مقام اپنا نہ منزل اس کو بھائے
خدا کو اپنی من بیتی سنائے

تجلی بے نقاب ایسی نہ چاہوں
غم پنہاں کہے میں مانگتا ہوں

وصال جاوداں سے باز آیا
فغان کی ' آہ کی لذت خدایا

نیاز و ناز آدم کا عطا ہو
مجھے حاصل گداز انسان کا ہو

سوال (۱)

مرا پہلا تحیر سوچ میری — نہ کیفیت پڑے پلے ہی اس کی
وہ کیسی سوچ ہے جو شرط رہ ہو — کبھی طاعت کبھی وہ کیوں گنہ ہو

جواب

ہے اندر آدمی کے جوہر ایسا — کہ ناپیدائی میں بھی ہے وہ پیدا
اچل ایسا جسے چلتا ہی پایا — کبھی نور اور کبھی بن نار آیا
کبھی وہ زار علم ظاہری سے — کبھی ہے نور علم باطنی سے
اجالے نور اس کا جان و دل کو — کرن اک اس کی سورج سے گراں ہو
بظاہر خاک بستہ ' لامکاں بھی — اسیر روز شب بھی ' لازمان بھی
نہ محتاج تنفس وقت اس کا — کوئی جوینده یابنده نہ ایسا
چھپڑ کر وہ کبھی ساحل پہ بیٹھے — اتھاہ ساگر کبھی کوزے میں اس کے
یہ ہے دریا بھی ' موسیٰ کا عصا بھی — کرے دو لخت یہ قلزم کی چھاتی
ہرن ایسا فلک جس کی چرن جا — پیئے پانی یہ جوئے کہکشاں کا
زمین بھی آسمان بھی اس کا ڈیرا — رہے سنگت میں بھی وہ سب سے تنہا
اسی کے روپ ہیں یہ نور و ظلمت — صدائے صور ' مرگ و حور و جنت
اسی سے آدم و ابلیس اجرے — گرہ ہر دو کی کھل پائے اسی سے
نظر بے تاب ہو جلوے سے اس کے — تجلی اس کی یزداں کو فریبے
ہے اک آنکھ اس کی اپنی خلوتوں پر — تو اک آنکھ اس کی اپنی جلوتوں پر
اگر اک آنکھ کو لیجے گنہ ہے — کہ دونوں ہی سے نکتا شرط رہ ہے
ندی اپنی سے ساگر کو جنم دے — گہر بن کر اسی کی تہہ میں بیٹھے
اسی پل روپ اور اپنا بنائے — بنے غواص پھر سے ود کو پائے
وہاں کی ہل چلوں میں بے خروشی — صدا و رنگ بے کان آنکھ واں کی
زمانہ اس کے ہے شیشے کے اندر
ہویدا ہو بتدریج آدمی پر

کمند انگن حیات اس کے ہی دم سے　　بلند و پست زیر دام لائے
کرے اپنے کو اپنا اس سے قیدی　　دبائے ماسوا کا ٹینٹوا بھی
بنیں دونوں جہاں نخچیر اس کے　　کمند اس کی انہیں پھندے میں لائے
اگر بس میں کرے تو دو جہاں کو　　مرے آفاق لیکن تو امر ہو
نہ چل آہستہ جنگل میں طلب کے　　یہ اپنے من کی دنیا جیت پہلے
زبر ہو زیر سے خود گیر ہی تو　　کہ اپنے قرب میں قرب خدا ہو

جو خود اپنے ہی اوپر فتح پائے
وہی تو جیت کر دنیا دکھائے

خوشا وہ دن جہاں بس میں کرے تو　　شگافے آسمانوں کے جگر کو
ب) قمر آئے ترے پاؤں کو چومے　　کمند دود میں تو اس کو جکڑے
رہے مختار ہوکر دہر میں تو　　تراشے سن کی مرضی پربتوں کو
نگوں کرنا جہان چار سو کا　　مقام نور و صوت و رنگ و بو کا
گھٹانا بیش کو کم کو بڑھانا　　جو اپنے جی میں آئے کرتے جانا
نہ دکھ سکھ پر کبھی بھی اس کے جانا　　طلسم آسمانی کو ہرانا
اترنا تیر بن کر دل میں اس کے　　نہ دینا گندم اس کو جو کے بدلے

شکوہ خسروی یہ ہی کہائے
بنیں یوں ملک و دیں جوڑے کے جائے

سوال (۲)

وہ کیا ساگر ہے جس کا علم ساحل ہو کیسا گوہر اس کی تہ سے حاصل

جواب

ہے یہ سانسوں کا جیون ایک دریا شعور و آگہی اس کا کنارا
بہت پرموج بھی یہ اور گہرا بغل میں اس کی صدہا کوہ و صحرا
نہ پوچھ اس کی اتر لہروں کے قصے کہ ہر موج اس کی ساحل کو پھلانگے
اٹھی دریا سے صحرا کو نمی دی نظر کو کیف و کم کی چاٹ بخشی
حضور اس کے کوئی بھی چیز آئے اسے روشن شعور اس کا بنائے
یہ خلوت مست ہے صحبت سے بھاگے مگر ہر شے منور اس کے دم سے
یہ ہر اک چیز کو پرنور کرکے بالاخر دام آئیں میں پھنسائے
ملا قرب جہاں اس آگہی سے وہ خود کیا ہے کھلا یہ بھی اسی سے
خرد نے اس کا گھونگھٹ کچھ اٹھایا رہاں نے اس کو عریاں تر بنایا

سمٹ ہے اس جہاں میں اس کی مشکل
یہ اس کی منزلوں میں ایک منزل

سمجھتا ہے جہاں تجھ سے جدا ہے یہاں جو کچھ ہے تجھ سے ماسوا ہے
جہان رنگ و بو اپنا اذاں گھر یہ آزاد ہم سے وابستہ بھی رہ کر
بندھے تار نظر میں ہیں خودی کے زمین و آسماں سورج ستارے
نہانی دل کو اس سے ایک رہ ہے کہ ہر موجود ممنون نگہ ہے
نہ دیکھے گر کوئی وہ زار ٹھہرے اگر دیکھے یم و کسار ٹھہرے

توانا یہ ہمارے دیکھنے سے
پھلے یہ نخل ہمارے پھولنے سے

نہ پوچھو ناظر و منظور کیا ہے
کہ ہر ذرے کا دل یہ کہہ رہا ہے

مجھے شاہد مرے مشہود کر دے
نظر کے فیض سے موجود کر دے

کمال ذات شے موجود ہونا
کسی شاہد کا ہے مشہود ہونا

زوال ذات شے ہے بے حضوری
ہماری آگہی سے اس کی دوری

ہماری ہی تجلی یہ جہاں ہے
صدا و نور بن اپنے کہاں ہے

اسی کے سنگ سے یاری طلب ہو
سدھا خم پیچ سے اس کے نظر کو

یقیں کر تو کہ شیران شکاری
یہاں چیونٹی سے بھی چاہیں ہیں یاری

کر اس سے دوستی اور خود خبر ہو
کہ تو جبریل ہے ' بامال دہر ہو

نظر کثرت پہ کر چشم خرد سے
احد کے پھر کہیں دیکھے گا جلوے

ہو بہرہ یاب بوئے پیرہن سے
تو نکہت مصر کی کنعاں میں پائے

ہیں نخچیر خودی یہ چاند تارے
اسیر بند تدبیر اس کی سارے

جہاں میں پھیل جا تو آگ بن کر
چڑھائی کر مکان و لامکاں پر

سوال (۳)

ہے وصل ممکن و واجب بہم کیا　　یہ قرب و بعد کیا ہے بیش و کم کیا

جواب

جہان چند وچوں ہے تین طرفا　　خرد سے کیف و کم سمجھیں ہم اس کا
یہ دنیا طوسوی ' اقلیدسی ہے　　"زمیں یار" عقل کو کافی یہی ہے
زماں بھی اور مکاں بھی اس کے مایا　　زمیں بھی ' آسمان بھی اس کے مایا
چڑھا چلے کماں اور پا ہدف کو　　سمجھ معراج کو اس بات سے تو
بجز نور السموات اس جہاں میں　　نہیں ہے کوئی مطلق جس کو مانیں
حقیقت لازمان و لامکاں ہے　　نہ کہہ ہرگز کہ عالم بیکراں ہے
حقیقت کی حقیقت بے کرانی　　بلند و پست و بیش و کم سے خالی
کہ باطن میں ہے بالائی نہ زیری　　مگر خارج میں ہے وسعت پذیری
نہ عقل اپنی ابد کو جان پائے　　کہ یہ تو ایک کو سو کر دکھائے
اپاہج ہے سکوں سے پیار رکھے　　بجائے مغز چھلکے یار اس کے
حقیقت کو کیا صد پارہ جب سے　　گھڑے ہیں ثابت و سیار ہم نے
مکاں اک لامکاں میں کرکے پیدا　　زماں کا عقل نے زنار پہنا
زماں کو اپنے من میں تو نہ جانچا　　اسے دن رات سال و مہ میں بانٹا
نہیں اس سال و مہ کا وزن کوئی　　لگا تو "کم لبثتم" میں بھی ڈبکی

تو اپنے آپ کو پا' چھوڑ جھگڑے
یہی بہتر ہے من ساگر میں اترے

یہ ہے اک بات جاں تن سے جدا ہے — اسے ایسا سمجھنا ناروا ہے
نہاں جاں میں ہے رمز کائناتی — بدن حالت ہے اک احوال جاں کی
پھبا معنی پہ یہ صورت کے غازے — نمود اپنی کو سو روپی بنائے
حقیقت سرخ پہ خود پردہ گرا کر
اٹھائے کوئی چاہے یہ بھی آکر

.

فرنگی دو سمجھ کر جان و تن کو — ہے دو کہنے لگا دین و وطن کو
جپے ہے پطرسی مالا کلیسا — کہ اس کو حاکمی سے واسطہ کیا
یہ کار حاکمی کا مکرو فن ہے — کہ تن بے جان ہے، جاں بے بدن ہے
خرد کو دل کا کرکے ہم سفر تو — ذرا کر ترکمانوں پر نظر تو
فرنگی ریس میں وہ خود سے بھاگے
تعلق ملک و دیں کا وہ نہ سمجھے

اسے جو ایک تھا سو لخت کرکے — گنت کے واسطے ہندسے تراشے
تو جس دنیا کو مشت خاک سمجھا — ہے ذات پاک کی، ہونی کا لمحہ
عجب ہیں فلسفی مردے سنگاریں — ید موسیٰ، دم عیسیٰ نہ رکھیں
نہ میں نے فلسفہ میں کچھ بھی پایا — مجھے اک اور حکمت نے رجھایا
کہوں میں یہ جہاں ہر آن بدلے — دروں زندہ، نہیں واقف سکوں سے
تو اپنا گنتیوں کانج کے چکر — نکل کر اس سے آگے جھانک اندر
بڑا کل سے ہوا جز جس جہاں میں — وہاں رازی کی، طوسی کی نہ مانیں
ارسطو سے بھی رکھ صاحب سلامت — بھلی ہے ساتھ بیکن کے بھی سنگت
مگر ان کے ٹھکانوں سے نکل جا — نہ ہو منزل میں گم آگے نکل جا
کمی بیشی کی خوگر عقل سے تو — کہ جانے جو دل دریا و کاں کو
جہان چند وچوں کو رام کرکے — مہ و پرویں کو گھر اپنا بنالے
مگر تو سیکھ حکمت دوسری بھی — کہ مکر روز و شب سے ہو رہائی
ٹھکانا اس جہاں سے پار تیرا
جہاں دن کو نہ ڈس جائے اندھیرا

سوال (۴)

قدیم و محدث اک دوجے سے کیسے　　کٹے اور خالق و مخلوق ٹھہرے۔
خدا عارف بھی گر معروف بھی ہے　　طلب کیا اور مشت خاک کی ہے

جواب

فراق عارف و معروف خیر ہے　　خودی کی زندگی ایجاد غیر ہے
قدیم و حادث ہے گنتی کا چکر　　گنت چکر ہے یہ گیتی کا چکر
گنے جاتے ہیں ہم امروز و فردا　　کہ ہوگا ' ہے ' ہوا ' سے کام اپنا
کٹیں اس سے یہی فطرت ہماری　　تڑپ واماندگی فطرت ہماری
جدائی بھی پرکھ اپنی نہ ٹھہرے　　نہ اس کو بن ہمارے چین آئے
ہم اس سے اور وہ ہم سے دور کب ہے　　یہ وصل اندر بھی ہو فرقت عجب ہے
جدائی سے یہ مٹی دیدہ ور ہو　　کہ بخشے کوہ کا سرمایہ کہ کو
جدائی عشق کو سنگار جائے　　جدائی عاشقوں کے دل کو بھائے
ہیں ہم زندہ بفیض درد مندی　　ہیں پابندہ بفیض درد مندی
میں اور وہ کیا ہے ؟ اسرار الہی　　ہمارے دایم ہونے کی گواہی
اسی کا خلوت و جلوت میں جلوہ　　ہے رہنا انجمن میں اصل رہنا
محبت انجمن میں دیدہ ور ہو　　اسی صورت ہی تو وہ خود نگر ہو
ہماری بزم میں جلووں کی برکھا　　جہاں ناپید ہے اور وہ ہے پیدا
در و دیوار و کاخ و کو نہ کوئی　　فقط ہم ہیں یہاں اور ذات اس کی
کبھی بیگانگی ہم کو دکھائے　　کبھی ہم کو وہ مثل ساز چھیڑے
ہم اس کی سنگ سے مورت بنائیں　　کبھی نادیدہ ہی سجدے میں جائیں
کیا ہر پردۂ فطرت کبھی چاک　　جمال یار دیکھا ہو کے بے باک

جنوں ایسا یہ مشت خاک پانے — کہ اس کے اندرونے کو اجالے
جنوں مست ہے عجب فرقت رلائے — مگر فرقت ہی اس کو راس آئے
جدائی نے نظر ایسی عطا کی — سحر میں اس نے اپنی شام ڈھالی
خودی کو درد دے کر امتحاں کا — کیا دیرینہ غم کو عیش تازہ
گہر لڑیوں پروئے چشم تر سے — لیا میٹھا ثمر قبری شجر سے
خودی کو بے تکلف بھینچنے سے
فنا بر دوش ہو جائے بقا کے

محبت منزلوں سے پیار بھی ہے — محبت ان سے جانا پار بھی ہے
محبت کب بھلا انجام چاہے — کہاں اس کی سحر ہر شام آئے
خرد کی طرح پرپیچ اس کے رستے — چمک کر پل میں اک دنیا رچا دے
ہمارے منتظر ہیں جگ ہزاروں — بھلا کیوں ختم اپنی یورشیں ہوں
مسافر جاوداں رہ جیتے مرتے — مقابل آئی دنیا رام کرتے
ہمارا انت کب دریا میں کھونا — اسے پانا ، نہیں نابود ہونا
خودی کیوں کر سمائے خود خودیِ میں
ہو عین خود کمال اس کا یہ جانیں

سوال (۵)

مری میں کا مجھے کوئی پتا دے　　من اندر کا سفر کیا ہے بتا دے

جواب

خودی تعویذ ہے حفظ جہاں کا　　حیات ہے پرتو ذات اس کا پہلا
سہانے خواب سے یہ جاگ اٹھے　　بڑھے اندر سے ہندسہ اک کا جیسے"
کشود اس کی نمود ہے یہ ہماری　　نمود اپنی کشود اس کی ہے ساری
ضمیر اس کا سمندر بے کنارا　　تڑپتی لہر ہے ہر قطرہ اس کا
شکیبائی نہیں اس کو گوارا　　کہ پھر فردا" ہی فردا" ہو ہویدا

حیات آتش ، انائیں ہیں شرارے　　حضر میں بھی سفر میں جیسے تارے
کہیں جائے نہ جائے پھر بھی سب کو　　بھری محفل میں یہ تنہا نشیں ہو
عجب اس کی بخود پیچیدگی ہے　　کہ تڑپی خاک سے بالیدگی ہے
نہاں آنکھوں سے اس کی ہا وہو ہے　　دما دم جستجوئے رنگ و بو ہے
ہے بھاگم بھاگ میں سوز دروں سے　　کچھ اس صورت کہ خود اپنے سے الجھے
جہاں میں نظم الجھاؤ سے اس کے　　کف خاکی کو یہ آئینہ کر دے
خودی اس کے ہی پرتو کی عطا ہے　　سدا اس بحر سے گوہر اٹھا ہے
ہے پیکر خاک کا پردہ خودی کا　　طلوع اس کا طلوع مہر گویا
ہے خاور اس کا یہ سینہ ہمارا　　اسی جوہر سے ہم میں نور سارا
کہے تو میں تجھے میں کی خبر دوں　　من اندر کا سفر کیا ہے بتاؤں
خبر دی تجھ کو ربط جان و تن کی　　سفر کرمن میں صورت جان من کی
سفر من کا جنم بن باپ ماں کے　　زمیں پر محرم ہونا آسماں سے
ابد اک پل کی بے تابی کا حاصل　　نہ ہونا دید کو کرنوں کا سائل

امید و بیم کا ہر نقش دھونا
سمندر پار کرنا بن کے موسیٰ

مٹا دینا طلسم بحر و بر کو
بیک انگشت شق کرنا قمر کو

پلٹنا ایسے اس کے لامکاں سے
اسے من میں جہاں کف پر ٹکائے

کٹھن ہے راز یہ ہونٹوں پہ لانا
ہے شیشہ دیکھنا مٹی بتانا

کہوں کیا تجھ سے کس پل اس انا کا
عیاں جس کو کرے انا عرفنا

فلک پر تھرتھری سی اس کے فر سے
زماں بھی اور مکاں بھی بس میں اس کے

دل آدم کو گھر اس نے بنایا
کف خاک اور یہ بھاگ اس نے پایا

جدا بھی غیر سے وابستہ بھی ہے
بخود گم ' اور سے پیوستہ بھی ہے

خیال اور ست خاک اس کا ٹھکانا
جہاں جب چاہے جس کا آنا جانا

یہ کیا ہے قید بھی آزاد بھی ہے
کمند و صید بھی صیاد بھی ہے

ترے سینے کے اندر اک دیا ہے
سمجھ اس آئینے میں نور کیا ہے

نہ بھول اس کو امیں اس کا ہے تو ہی
ارے نادان دیکھ اپنی طرف بھی

سوال (۶)

وہ جز افزوں جسے ہم کل سے پائیں　　سراغ اس جز کا ہم کیسے لگائیں

جواب

خودی ہے اپنے اندازوں سے باہر　　جسے تو کل کہے اس سے ہے بڑھ کر
فلک سے یہ گرے گر گر کے ابھرے　　گرے بحر زمان میں پھر سے ابھرے
تہ گردوں وہی وہ خود نگر ہے　　وہ پرواز آشنا بے بال و پر ہے
سیاہ آباد لیکن نور در بر　　نہیں جنت میں لیکن حور در بر
رسیلی نطق ایسی اس نے پائی　　کہ موتی زندگی کی تہہ سے لائی
ضمیر زندگانی جاوداں ہے　　بظاہر گو وہ پابند زماں ہے
مقدر اس کا یہ دنیائے فانی　　نمود اپنی پھر اس کی پہرے داری
وہ کیا ہے ' کیا نہیں ہے ' پوچھنا کیا　　کہ تقدیر اس کی ہے فطرت کا حصہ
وہ کیسی ہے ' نہیں کیسی ' کہوں کیا　　ہے من مختار ' تن مجبور اس کا
حدیث خواجہ و سلطان بدر ہے　　کہ ایماں درمیان جبر و قدر ہے
تو ہر مخلوق کو مجبور جانے　　اسیر بند نسرد و دور جانے
مگر جان آفریں کے دم سے جاں ہے　　ہزاروں جلوتوں میں جو نہاں ہے
اسے مجبور کہنا رایگاں ہے　　کہ جاں آزاد فطرت ہے تو جاں ہے

جہان کیف و کم پر اس کا دھارا
تھا مجبوری سے مختاری کو جانا

•

یہ جب بھی گرد مجبوری کو جھٹکے　　جہاں کو خوش عناں ناقہ بنائے
فلک اس کا اشارہ پا کے گھومے　　ستارہ اس کی ہی شفقت سے چمکے

کرے بے پردہ جو اس میں ہے مضمر　　تکے اپنی نظر سے اس کا جوہر
پرے باندھے ہوئے نوری کھڑے ہیں　　پئے دیدار رستے میں پڑے ہیں
ملک پی کر شراب تاک اس کی
کسوٹی اپنی جانے خاک اس کی

دکھوں کیا اس کو کیسے پایا جائے　　مقام ہامی وہو اس کو لبھائے
ابد پر وار تو دن رات اپنے　　فغان صبح کو ٹکرا خرد سے
خرد کی ہے متاع ساری حواسی　　کرن ہے عشق کی پونجی فغان کی
خرد جز کو فغاں کل کو قبولے　　فغاں زندہ خرد تازندہ ٹھہرے
خرد کا ظرف ہے چھوٹا ابد سے　　گنے گھڑیاں گھڑی کی سوئی بن کے
تراشے یہ سدا راتیں سویرے　　شرر چنتی رہے شعلے کو چھوڑے
تری پونجی فغان عاشقانہ
نہاں سے اس کے پل میں اک زمانہ

دکھانے کو خودی امکاں اپنے　　گرہ اندر کی اپنے کھول ڈالے
اسے تو آنی و فانی بتائے　　نہ تجھ میں نور وہ جو اس کو پائے
اٹلنی موت کا بے کار ڈر ہے　　خودی ہو جائے پختہ تو امر ہے
مگر اک موت کا رہتا ہے کھٹکا　　مرے دل کو جو ہے سب کچھ ہی میرا
خیال عشق و مستی چھوڑ جانا　　شرار اپنے کو تنکے سے بچانا
کفن اپنے لئے خود آپ سینا　　فنا اپنی کو آنکھوں دیکھ لینا
اجل یہ تاک میں ہر دم لگی ہے　　ڈر اس سے مرگ ہم سب کی یہی ہے
ترے پیکر میں تیری قبر کھودے
نکیرین اس کے ہیں پہلو میں تیرے

سوال (۷)

کہیں کس کو مسافر ، کون راہ رو
ہے کامل مرد ہم سمجھیں گے کس کو

جواب

نگہ ڈالے اگر تو دل پہ اپنے
تو منزل اپنی سینے ہی میں پائے
حضر میں ہی سفر کا حظ اٹھانا
ہے اپنے ہی سے اپنی اور جانا
یہاں پر کون جانے ہم کہاں ہیں
سمجھ ہم کو مہ و اختر نہ پائیں
ترا کب انت ہے کیوں انت کھوجے
ہے انت اس کے لئے جو جاں نہ رکھے
ہمیں کہہ خام ، پختہ کہہ نہ بالکل
ہر منزل مکمل نامکمل
ہے بے انجام رہنا زندگانی
سفر ہم کو حیات جاودانی
زمین و آسماں زد میں ہماری
مکاں بھی اور زماں بھی گرد ، رہ کی
نمودی بے کلی میں پیچ کھائیں
وجودی تہ سے اٹھتی موج ہم ہیں
سدا رہ گھات میں اپنی یہاں تو
یقین اپنا کے کر ترک گماں تو
تب و تاب محبت بے فنا ہے
یقیں کی دید کی کب انتہا ہے
ہے دید ذات حاصل زندگی کا
طریق اس کا جہت پھندوں سے بچنا
تری خلوت ہو ایسی ذات حق سے
کہ دیکھے تو اسے وہ تجھ کو دیکھے
منور من میں اپنی نور سے ہو
مٹے جھپکے یہاں پر جو نظر کو
حریم یار میں جل• اس طرح تو
عیاں خود کو نہاں چمکائے اس کو

امام دہر ہے کی دید جس نے
وہی کامل ہے ، ہم تم ہیں ادھورے

کیئے جا جستجو گر مل نہ پائے
نہ دامن چھوڑ اگر وہ ہاتھ آئے

فقیہ و شیخ پر ہرگز نہ جانا
نہ مچھلی کی طرح کانٹا بھلانا

وہ کار ملک و دیں میں مرد رہ ہے
ہم اندھے ہیں وہی صاحب نگہ ہے

مثال مہر جو ہر صبح ابھرے
نظر ہر بال جڑ سے اس کی پھوٹے

فرنگی نے ہمیں جمہوریت دی
کہ رسی گردن شیطاں سے کھولی

نوا اس کی رہین ساز و زخمہ
ہے طیارے کا محتاج اس کا اڑنا

بھلی اس کے چمن سے کشت ویراں
بھلا ہے شہر سے اس کے بیاباں

لگے ہیں لوٹنے میں کاروانی
ہے ساری دھن شکم یاروں کی "نانی"

ہے من سویا ہوا اور تن ہے بیدار
ہنر بھی دین و دانش بھی ہوئے خوار

خرد ہے کافری ' کافر گری ہے
کہ افرنگی کا کام آدم دری ہے

یہاں پر ایک گھاتی دوسرے کا
خدا سمجھے یہی ہے گر وتیرہ

سنا دے غربیوں کو بات میری
کہ ہے جمہوریت تلوار ننگی

یہ تلوار ہے کہ جانیں چھین لے ہے
نہ کافر سے نہ مسلم سے ٹلے ہے

نیام اس کو نہ ہرگز راس آئے
یہ اوروں کو بھی ' خود کو بھی مٹائے

سوال (۸)

بتائے کوئی نکتہ بھی انا الحق کہ ہرزہ گوئی تھی وہ رمز مطلق

جواب

کہا راز انا الحق پھر سے میں نے سنایا ہند اور ایراں کو پھر سے
یہ میخانے میں اک مغ نے کہا تھا کہ جانداروں کی "میں" ہے محض مایا
خدا کے ہم تو ہیں بس خواب زادے
نمود و ہست اپنی خواب ہی سے

بلند و پست خواب و چار سو خواب سکون و سیر و شوق و جستجو خواب
دل بیدار عقل نکتہ بیں خواب گمان و فکر و تصدیق و یقیں خواب
یہ بیدار آنکھ تیری خواب میں ہے ترا قول و عمل بھی خواب میں ہے
وہ جاگے گا تو پھر ہوگا نہ کوئی
متاع شوق کی بکری نہ ہوگی

فروغ عقل ہے سارا قیاسی قیاس اپنے کی بنیاد ہے حواسی
جو حس بدلی تو یہ دنیا بھی بدلی سکون و سیر بھی اور کیف و کم بھی
یہ کہہ سکتے ہیں دنیا رنگ و بو کی زمین و آسمان و کاخ و کو کی
فقط اک خواب سا ہے یا فسوں ہے یہ اک پردہ بروئے بے چگوں ہے
فریب ہوش ممکن اس کو کہنا سماعت کا بصارت کا بھلاوا

خودی سے اور جہان رنگ و بو سے — حوای ربط اس سے ہو نہ پائے
نظر بار اس کے ہاں ہرگز نہ پائے — اسے تو بے نظر ہی دیکھا جائے

نہ اس کے روز و شب دین آسماں کی
ظن و تخمیں نہ خود بینی میں کوئی

اگر سمجھے کہ میں وہم و گماں ہے — نمود اس کی لبسان این و آں ہے
گماں کس نے کیا اتنا تو بتلا — پتہ "من جھانک" دے اس بے پتے کا
جہاں ظاہر پہ محتاج و دلیل ہو — سمجھ پائے نہ جبرائیل اس کو
خودی پنہاں مگر حجت نہ چاہے — کبھی سوچا بھی ہے یہ راز کیا ہے
خودی کو حق سمجھ ' باطل نہ ٹھہرا — اسے تو کشت بے حاصل نہ ٹھہرا
یہ ہو پختہ تو کم ہونا نہ جانے — کہ عاشق وصل ہی فرقت کو مانے
شرر کو تیز اڑنا مل سکے ہے — ہمیشہ کا تڑپنا مل سکے ہے
دوام حق ہے نہ امر کار اس کا — اگر نہ جستجو سے اس نے پایا
دوام اچھا ہے جاں گو مستعار ہو — بمن عشق و مستی پائیدار ہو
وجود کوہ و دشت و در بھی مایا — خودی باقی ہے باقی سب ہی مایا
نہ قصہ شنکر و منصور کا کہہ — تو اپنے ڈھب سے رب کو ڈھونڈھتا رہ

خودی کی بھال میں گم خود میں ہو تو
انا الحق کہہ کے صدیق خودی ہو

سوال (۹)

ہوا ہے سر وحدت فاش کس پر سمجھ پایا ہے کیا عارف نے آخر

جواب

تہ افلاک مسکن دل ربا ہے پر اس کے مہر و ماہ کو کم بقا ہے
اٹھائی شام نے سورج کی ارتھی ستاروں کو قمر پہنائے کفنی
سرکتی ریت ہو جاتا ہے ہر بت پلوں میں اور ہو دریا کی حالت
گلوں کی گھات میں باد خزاں ہے متاع کارواں ہی خوف جاں ہے
لٹیں لالے کے گوہر شبنمی سے اگر اک پل ہوں دوجے پل نہ ہوں گے
سرنگی میں مرے سر ان سنی ہی چنگاری سل کے اندر ان اڑی سی
بڑے ہی ہاتھ لمبے موت کے ہیں
دموں سے ہم اسیر اس کے ہوئے ہیں

غزل

فنا کو بادہ ہر جام کرکے ستم ڈھایا اسے یوں عام کرکے
تماشا گاہ مرگ ناگہاں کا جہان ماہ و انجم نام کرکے
کسی ذرے نے خو رم کی جو سیکھی اسے چھوڑا نظر سے رام کرکے
قرار ہم سے طلب کرتا ہے ہم کو اسیر گردش ایام کرکے
پھٹے سینے میں تیرے ہو خودی ' رکھ
اس اختر کو چراغ شام کرکے

سرا سر جانہاروں کی ہے دنیا یہی عرفاں ہے اس سفری سرا کا
ہمارا دل نہیں باطل کا کھوجی نہ بے حاصل سا غم پونجی ہماری

یہاں مٹنے نہ دے تو آرزو کو سرور ذوق و شوق جستجو کو
خودی کو کرسکیں ہم لازوالی فراقی کو بنا لیں ہم وصالی
ہے گرم آہ سے دیا ممکن جلانا
سوئی سے چاک گردوں سی دکھانا

خدائے زندہ میں ذوق سخن ہے تجلی ہے اگر تو انجمن ہے
ہے کس نے دل پہ جھیلی برق جلوہ پیا ہے جام مے سارے کا سارا
عیار حسن و خوبی دل ہے کس کا طواف ہے کس کے گھر کا چاند کرتا
"الست" کس نے خلوت میں کہا تھا بلی کا راگ کس کی نے سے اٹھا
عجب آگ عشق نے مٹی میں پھونکی پھنکے سو ساز اک لے سے ہماری
اگر ہم ہیں تو گرداں جام ساقی اور اس کی بزم میں ہوہا بھی باقی
جلے دل اس کی تنہائی پہ میرا میں اس کی بزم آرائی کروں گا
خودی کو مثل دانہ بو رہا ہوں
اسی کے واسطے اس کو سنبھالوں

خاتمہ

تو ہے شمشیر گر کام اپنا پورا نیام اپنی میں کب تک چھپ کے رہنا
اٹھا دے ممکنات اپنی سے پردے مہ و خورشید و انجم تیرے بردے
یدبیضا بغل سے لا کے باہر بنا نور یقیں سے شب منور
ہے جس نے بھی نگہ دل پر جمائی شرر بوئے ' ستارے فصل پائی
شرر لے جو مرے اندر سے پھوٹا ہے رومی کی طرح خوں گرم میرا
نہیں تو آتش تہذیب نو سے
دروں تاریک اور تن چاند کرلے

وضاحت

(۱) انقلاب دیگرے مرحوم بشیر احمد ڈار نے مشرق پر مغرب کی یلغار مرادلی ہے (انیسویں صدی والی)' میرے خیال میں انقلاب روس کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں ان کو بہت خوش فہمیاں تھیں اور اپنے بھائی کو ۲۸ ستمبر۱۹۲۲ء میں لکھا تھا کہ "اسلام پر بہت اچھا وقت آنے والا ہے نہایت معنی خیز کہ روسی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد اشالین ہے۔ وزیر خارجہ بھی مسلمان ہے جس کا نام کمرہ خاں ہے۔ (زندہ رود جلددوم ص۲۶۴)

(۲) نقطہ نوری کہ نام او خود لیست (اسرار خودی - اقبال)

(۳) 'اک دانش نورانی' اک دانش برہانی' ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی (اقبال)

(۳ب) کمند درد میں جکڑنے سے جدید آلات کے ذریعے اس تک جا پہنچنے کی وہ فکری پیش گوئی مراد ہے جو اب تسخیر قمر نے ایک حقیقت بنا دی ہے۔ اور قمر نے واقعی آدمی کے پاؤں چومے ہیں۔

(۴) یہاں نور سے وہی "نقطہ نوری" مراد ہے جسے خودی کہا گیا ہے اور دام آئین سے ہر جاندار کا وہ انداز زندگی مراد ہے جس پر وہ چلتا رہتا ہے۔

(۵) اصل لفظ گلدستہ ہے جس کا (غیر معروف) مفہوم وہ مینار ہے جس پر چڑھ کر اذان دی جاتی ہے اور اس حدیث کے حوالہ سے کہ دنیا مومن کی مسجد ہے میں نے گلدستہ کا ترجمہ اذاں گھر کیا ہے۔

(۶) تین طرفوں سے مراد طول عرض اور گہرائی یا بلندی ہے۔

(۷) طوسی اور اقلیدس یونانی کے اندازوں اور مفروضوں پر مبنی۔

(۸) سورہ کہف آیت ۱۹ کی طرف اشارہ ہے۔

(۹) صبح اورانیم روز و شام نیست (جاوید نامہ - اقبال)

(۱۰) سازو از خود پیکر اغیار را۔ تافزاید لذت پیکار را۔ (اسرار خودی)

(۱۱) وضاحت کے گئے علامہ کے انگریزی خطبات کے ترجمہ میں یہی موضوع دیکھئے۔

(۱۲) نخل ماتمی - قبر پر اگایا ہوا درخت جو عموماً" پھل دار نہیں ہوتا کہ پھل کا لالچ قبر کو نقصان نہ پہنچائے۔ ہاں سایہ دار ہوتا ہے کہ قبر کو دھوپ سے بچائے رکھے۔

(۱۳) ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ (اقبال)

(۱۴) شکیبائی ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ خلق جدید اور ارتقا کی ضد جن کا تقاضا مختلف اُور منفرد ہوتے جانا ہے۔

(۱۵) دید کی حیثیت شیشہ کی ہے اور بتانا مٹی کی طرح کم وقعت اور غیر واضح کیوں کہ "حقیقت پہ ہے جامہ حرف تنگ" (اقبال)

(۱۶) قرآنی آیت کی طرف اشارہ - اس کی تفصیل اور تعبیر جدید کے لیے دیکھئے خطبات اقبال میں ہبوط آدم کی تشریح و توضیح۔

(۱۷) دم جاں آفریں سے وہ نفخ مراد ہے جس کی طرف قرآنی آیت ۹/۳۲ میں اشارہ ہے۔

(۱۸) حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں (اقبال)

(۱۹) جس نے مجھے دیکھ لیا اس نے خدا کو دیکھ لیا۔ (ایک حدیث)

(۲۰) جیسے خواب دیکھنے والا جب جاگتا ہے تو تنہا ہی رہ جاتا ہے۔ متاع خواب نہیں رہتا۔

(بحوالہ جواب سوال ۲)

کلیات اقبال فارسی مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز میں (ص۱۵۲) اور کتاب خانہ سنائی (ایران) والی کلیات میں بھی (ص۱۶۴) "زدانش در حضور مانبودن" مرقوم ہے لیکن میرے خیال میں یہ کتابتی سہو ہے اور بالائی شعر میں کمال ذات شے موجو "بودن" کے پس منظر میں آگے بات زوال شے کی چلنی چاہیے۔ اسی طرح ۱۵۴ کلیات لاہوری اور ص۱۶۵ ایرانی میں جہاں حقیقت لازوال و لامکاں لکھا گیا ہے۔ وہاں میرے خیال میں لازمان و لامکاں ہونا چاہیے۔ یا پھر لازوال کی جگہ لایزال ہو۔

تیسرے خطبے میں علامہ کے الفاظ میں :

"The infinity of the ultimate ego comists in the infinite possibilities of his creative actirities creative actirities ....."

(Page 52, Lines 18/19).

اقبال اکادمی پاکستان